توبہ

میرے اس طرح ایک دم سگرٹ چھوڑنے پر سبھی حیران ہیں اور جب کوئی مجھ سے اس کی وجہ پوچھتا ہے تو آپ ہی کہیے میں کیا جواب دوں۔ یہی نا کہ مضر چیز تھی چھوڑ دی۔

جب میں نے شارع عام میں سگرٹ پینے شروع کر دیے تو امّی نے دس دس کے دو نوٹ میرے ہاتھ پر رکھ کر کہا ''لے آج سے توبہ کر کہ آئندہ سگرٹ پیوں تو اپنی امّی کا خون پیوں''۔ میں نے نوٹ جیب میں ڈال لیے۔ کان کھجایا۔ ناک صاف کی گلے کی خراش دُور کر کے امّی کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور توبہ کر لی۔ انھوں نے فرطِ محبت سے میری پیشانی چوم لی۔ وہ میری صحت کے متعلق ہر وقت پریشان رہتی تھیں۔

دوسرے دن جب وقت دیکھنے کے لیے انہوں نے میرے کوٹ کی غلط جیب میں ہاتھ ڈال دیا جہاں بجائے فیورلیوبا کے ولز کی ایک ڈبیا پڑی تھی تو میں نے کروٹ بدل کر دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ جسم پر پسینے کی ہلکی سی یورش ہوئی۔ اور دس دس کے دو نوٹ اور ایک بوسہ میرے ماتھے پر ''اینٹی فلوجس ٹین'' کے پلستر کی طرح چمٹ گئے۔ امّی نے کہا ''پونے دس'' اور ابا جی لفافے پر پتہ لکھ کر بولے ''لے بھئی ترے ساتھ ایک سودا کرتے ہیں اعجاز''۔۔۔۔ ''کیا'' میں نے پھر کروٹ بدلی۔۔۔ ''تو سگرٹ پینا چھوڑ اور اس کے عوض جو انعام چاہتا ہے ہم سے مانگ لے۔ مگر ہو ہماری بساط میں''۔ امّی کا چہرہ دم بھر کے لیے متغیّر ہوا۔

پھر انہوں نے روئی کی ایک چھوٹی سی پھریری ''پین کلر'' سے تر کر کے داڑھ میں رکھ لی اور کروشیئے سے دبانے لگیں۔ وہ نو آموز جواری تھیں۔ کل ہی انہوں نے بیس روپیہ کا داؤ ابّا سے پوچھے بغیر لگایا تھا اور ہار گئی تھیں۔ ''سی سی'' کرتے ہوئے وہ اپنی ہار بھی پھریری کے ساتھ کروشیے کی مدد سے دباتی رہیں۔

''مجھے منظور ہے'' میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

انہوں نے سگرٹ سلگایا اور دیا سلائی کی بجھی ہوئی تیلی کان میں پھیر کر بولے۔

''تو بتا پھر؟''

''سائیکل لے دیجیے'' مجھے اس کی سخت ضرورت تھی۔

''مگر تیرے پاس ہے جو'' وہ حیران رہ گئے۔ جیسے میں اسے گروی رکھ آیا ہوں۔

''وہ کوئی سائیکل ہے'' میں نے اپنے چہرے پر طنز اور حقارت کی ساری علامات پیدا کر کے کہا۔ ''چلتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی پھٹتے ہوئے بموں کو لکڑی سے پیٹ رہا ہو''۔

''تو پھر ابّا جان مسکرائے۔

''کہہ جو دیا نئی لے دیجیے۔ اب میں اس سائیکل پر جاتا ہوا اچھا لگتا ہوں کیا؟ بی۔ ایس۔ اے اچھا ماڈل ہے۔ خوبصورت کا خوبصورت اور مضبوط کا مضبوط۔ میں تو وہی لوں گا۔۔۔۔ باقی سب بکواس ہے۔ ہے نا ابا جی''۔ وہ خود بھی بی۔ ایس۔ اے کو پسند کرتے

تھے۔میں نے تیر چھوڑا۔''یا ڈیل کارنجی''۔

''مگر آج کل؟ان دنوں؟۔۔۔''وہ سوچتے ہوئے بولے۔میں درپے ہو گیا۔

گھنٹہ بھر کی بحث کے بعد فیصلہ ہوا کہ اچھا مل جائے گی۔مگر اس شرط پر کہ پھر کبھی سگرٹ کو ہاتھ نہ لگاؤں۔ابّا جان کو اپنے سگرٹوں سے کتنا پیار تھا۔ان کو میری صحت سے زیادہ اپنے سگرٹوں کی فکر تھی جو آئے دن ان کے ڈبے سے اغوا کر لیے جاتے تھے۔جب تک سائیکل گھر نہ پہنچ گئی ہم نے سگرٹوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔اسی ایک خیال میں مگن دل کو تسلّی دیا کیے۔نشہ کی طلب ہوتی تو ٹھنڈے پانی کے دو چار گلاس حلق میں انڈیل لیتے۔اس سے تسکین بھی ہوتی اور تکلیف بھی اور جس دن بندوق مار کہ سائیکل ہمارے ہاتھ میں آئی تو سڑک پر چکر لگاتے اس کی ''ٹرائی'' لیتے پانڈے بھیّا کی دوکان پر پہنچ کر چپکے سے کونڈر کی ایک ڈبیا کوٹ کی جیب میں ڈال لی۔دل کی رفتار میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔مگر دل کا کیا ہے۔

وہ تو دھڑکتا ہی رہتا ہے آہستہ نہ سہی ذرا تیز سہی۔

نوحہء غم اور نغمہء شادی دونوں ہنگامہ پرور چیزیں ہیں اور ہم اس وقت نغمہء شادی والے ہنگامے کو اپنائے ہوئے تھے۔دونوں بھائیوں کی شادی ایک ہی جگہ ایک ہی وقت ہو رہی تھی۔گھمسان کا رن تھا۔خوب غل ہوا چخ مچا۔ہر کوئی نفسانفسی اور آپا دھاپی کا شکار ہو گیا۔سامنے کے میدان میں برات کے لیے شامیانہ نصب کیا گیا تھا۔اینٹیں جوڑ کر غسل خانے اور موتریاں تیار کی گئیں۔رونق بڑھانے کے لیے رنگ برنگی جھنڈیاں نیلے پیلے بلب لگا رکھے تھے۔ہر دروازے پر سنہرے حروفوں والا ''ویل کم'' کا بورڈ بادل ناخواستہ لٹک رہا تھا اور مرے پر سودرّے یہ کہ اس شور میں ایک بگڑا ہوا لاؤڈ سپیکر بھی اسی طرح کھپا دیا گیا تھا جیسے دیوالی کے پٹاخوں میں کسی نے بہت ہی بھونکنے والے کتّے کو پٹہ ڈال کر باندھ دیا ہو۔

مجھے جس کمرے میں جگہ ملی وہ ایک جعفری تھی۔گھر کے بیرونی برآمدے کے آخری کونے میں۔وہاں دو چار پٹاں بچھی تھیں۔ایک کی اور گنجائش تھی۔کیونکہ اس خالی جگہ میں اس قسم کی متعدد چیزیں پڑی تھیں جو اٹھائی نہ جا سکتی تھیں یا جن کے سمیٹنے پر کوئی دھیان ہی نہ دیتا تھا۔مثلاً پرانی چارپائیوں کا بان،ٹوٹے ہوئے ڈمبل،اکھڑا ہوا چرخہ،بگڑا ہوا سٹول لیمپ،برف جمانے والی مشین کے چند حصّے۔ایسی چیزیں نہ تو گھر میں رکھی جا سکتی ہیں اور نہ ہی باہر پھینک سکتے ہیں۔جعفری کے علاوہ ان کے لیے کوئی موزوں جگہ نہیں ہو سکتی۔جعفری نہ گھر ہوتی ہے نہ باہر۔اور کچھ انہی چیزوں کا سا حال ہمارا تھا۔میرے ساتھ ایک تھانے دار صاحب بھی تھے۔یہ ہمارے ساتھ برات میں آئے تھے یا لڑکی والوں کے کوئی رشتہ دار تھے مجھے اس کا علم نہیں۔بہر حال ان کا بستر دوسری چارپائی پر لگا دیا گیا۔مگر اس بستر کو ان کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔کھونٹی پر وردی لٹکا کر ایسے غائب ہوئے کی ان کی آمد کا یقین ہی نہ ہوتا تھا۔یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کھونٹی پر وردی کہیں سے آ کر چمگادڑ کی طرح خود بخود لٹک گئی ہو۔

ساتھ والے کمرے کی دو کھڑکیاں جعفری میں کھلتی تھیں۔یہاں دونوں دلہنیں مانجھے بیٹھی تھیں۔کبھی کبھار ہلکی سی کھسر پھسر یا دبی دبی ہنسی کی آواز اس کمرے سے بلند ہوتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔میری پائنتی کی طرف میز پر ایک گرامون اور ایک ایمپلی فائر پڑا تھا۔یہاں

سے دو تاریں باہر بانس سے بندھے ہوئے بھونپو کو جاتی تھیں اور سرہانے کی طرف ایک تپائی تھی۔ اس پر ایک پھٹا ہوا رسالہ اور اون کا دو تین گز لمبا الجھا ہوا تاگا پڑا تھا۔

تپائی پر سیاہی، جمے ہوئے دودھ اور کھڑے ہوئے پالش کے نشان تھے۔ دیوار پر تین سال پرانا اصغر علی محمد علی کے سو برس کے راز والا کیلنڈر لٹک رہا تھا۔ چارپائی کے نیچے ان گنت پرانے بوٹ، سلیپر، سینڈل اور پوٹھوہاری جوتے پڑے تھے اور فرش پر گرد کے علاوہ سرخ سرخ بجری کے چھوٹے چھوٹے ذرات جو جوتوں کے ساتھ اندر چلے آتے تھے غالچے کی طرح بچھے ہوئے تھے۔ یہ جگہ اچھا خاصا کمرہ ہی تو تھی۔ پھر یہاں بیٹھ کر ہر کوئی ادھر ادھر کی ہر چیز کا جائزہ اچھی طرح سے لے سکتا تھا۔

جب برات شامیانے میں داخل ہوئی تو ہر کوئی نظارہ کرنے دوڑ کر برآمدے میں آ گیا۔ ہم سب نے اچھے اچھے کپڑے پہنے تھے اور گلے میں گیندے کے پھولوں کے ہار ڈال رکھے تھے۔ لیکھا برآمدے میں ننگے پاؤں کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ میں نے ہار گلے سے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا اس پر وہ ہنسنے لگی اور میں نے گھبرا کر اپنا ہار ساجی کے گلے میں ڈال دیا۔ شہ بالا کے جتنے بھی ہار ہوں کم ہے۔ میں لیکھا سے بہت پہلے کا واقف ہوں۔ جب وہ آٹھویں میں تھی۔ نویں میں ہوئی۔ دسویں پاس کر لی اور جب وہ کالج میں داخل ہونے کے لیے روتی رہی۔ وہ دلہنوں کی سہیلی تھی۔ میں کئی چھٹیوں میں خالہ کے ہاں آیا کرتا تھا۔ یہیں سے اسے جاننے لگا تھا۔ اس کا قد لمبا تھا۔ رنگ سانولا، ناک بہت ستواں اور نیم باز لمبی لمبی پلکیں بند ہوتی چھوئی موئی کی طرح اتنی پیاری کی چھونے کو جی چاہتا۔ لال قلعہ دہلی کے عجائب گھر میں عین اسی کی شکل کی ایک عرب لڑکی کی تصویر ہے۔ پر دُور کیوں جایئے۔ آپ نے کوئی لیکھا نہیں دیکھی۔ لمبے قد کی خوبصورت آنکھوں والی جس کے سر پر ہمیشہ سفید نینا وَن کا منقشین دوپٹہ ہو۔ بس وہی تو ہے لیکھا۔ میری لیکھا! اسے میں نے جب بھی دیکھا ننگے پاؤں دیکھا جب وہ چلتی تو یوں معلوم ہوتا کی زمین اس کے ننگے پاؤں چوم رہی ہو اور جب وہ زمین کے سینے سے چمٹ جاتے تو ایسا لگتا کی اب نی اٹھ سکیں گے۔ مگر وہ انھیں ایسے جھٹکے سے اٹھاتی کی اس کی کمر میں ایک لہر سی پیدا ہو جاتی اور وہ ناچتی ہوئی محسوس ہوتی۔ اس کی چال ایک رقص تھی، ایک ناتمام رقص جو ابھی شروع نہ ہوا ہو۔ مگر جسے ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ سانچے میں ڈھلے ہوئے پاؤں بیقرار مچھلیوں کی طرح ادھر ادھر تڑپتے رہتے اور ان پر ساٹن کی شلوار کے بھاری پائنچے بھنور کی طرح گھوما کرتے۔

میں جعفری میں بیٹھا ہو ممتاز کو خط لکھ رہا تھا۔ تھانیدار صاحب کی وردی کھونٹی پر لٹک رہی تھی اور ان کی پیٹی کا وسل اپنے اڈے سے نکل کر میرے سر پر معماروں کے ساہول کی طرح جھوم رہا تھا۔ پرلے کونے میں گراموفون پڑا تھا۔ لاؤڈ سپیکر کا مستری کبھی اندر آتا اور کبھی باہر بھونپو کے پاس جاتا۔ پھر اندر آ کر پیچ کش سے پاس پڑے ہوئے آلے میں کچھ ترمیم شروع کر دیتا۔ بھونپو کو آواز ٹھیک نہ تھی۔ بیچارا مستری صبح سے پنجرے کے شیر کی طرح ادھر ادھر حرکت کر رہا تھا۔ تھک کر اس نے پیچ کش پتلون کی جیب میں ڈال لیا اور ساؤنڈ بکس اٹھا کر پھر ریکارڈ کی شروع کی لکیروں پر رکھ دیا۔ کوٹ سے رومال نکال کر ماتھے پر پھیرا اور آرام کرسی میں لیٹ گیا۔ اچانک پھر اچھلا اور باہر بھونپو کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس طرح کے ڈیڑھ دو سو پھیرے مار چکا تھا۔ میل بھر کی مسافت طے کر لی ہوگی۔ میں نے دیکھا وہ بھونپو کے پیچ کھول یا کس رہا تھا۔ میں پھر خط لکھنے لگا۔ وسل اسی حالت میں جھوم رہا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر میں نے اسے دیکھا تو وہ بجنا شروع کر

دے گا۔

برآمدے کے آخری سرے پر بچے کھیل رہے تھے۔ دو قطاریں تھیں، زرق برق لباس تھے اور ننھے ننھے گیت۔ جب وہ ایک دوسرے کے طرف بڑھتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے رنگ برنگی پریاں جادو بھرے گانے گاتی جھلملاتے ہوئے چراغ لیے پھرتی یں ہیں۔ لڑکیوں کے بالوں میں ربن بندھے تھے اور آنکھوں میں سرمہ تھا۔ لڑکوں کی جیبوں میں کھانے پینے کی چیزیں ٹھسی ہوئی تھیں اور ہاتھوں میں ننھی ننھی چھڑیاں تھیں۔ وہ ''ہم ٹھنڈی موسم سے آئے ہیں'' کھیل رہے تھے۔ جب ان کا ہنگامہ بہت بڑھ گیا تو بیٹھک کے دروازے سے لیکھا نکلی، ننگے پاؤں اور مجھے جعفری میں بیٹھا ہوا دیکھ کر کھسکتی کھسکتی جعفری میں آنے لگی۔ میں نے خط لکھنا بند کر دیا۔ لمحہ بھر کے لیے اسے دیکھ کر میں بچوں کا تماشا کرنے لگا۔ ساجی کی باری تھی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور جھوم جھوم کر گانے لگا۔ ''ہم ٹھنڈی موسم سے آئے ہیں''۔ اور پھر ساری قطار کا جائزہ لے کر اس نے لیکھا کی چھوٹی بہن کی کلائی پکڑ لی اور کہا۔ ''ہم اس کو لینے آئے ہیں''۔ اور اپنی قطار کر طرف چلا گیا۔ مخالفوں نے شور مچایا کہ ''اس کو نہیں'' نام لو۔ ساجی پریشان ہو کر ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔ اس کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ بڑی بھاری کامیابی ایک منٹ میں ذلیل ترین شکست بن گئی۔ وہ گھبرا سا گیا۔ میں نے میز پر پنسل بجا کر لیکھا کو اپنی طرف متوجہ کیا جو کھڑکی سے کمر لگائے انہیں دیکھنے میں حد درجہ مشغول تھی۔ وہ مڑی اور مسکرانے لگی۔

''اس کا نام کیا ہے'' میں نے پوچھا۔ ''روپا'' وہ پھر مسکرائی اور جھک کر اپنی پنڈلی پر پڑی ہوئی ساٹن کی شلوار کھجانے لگی۔

میں جعفری کی دیوار کے پاس آیا۔ سوراخ کے پاس منہ کر کے زور سے بولا ساجی! ساجی! ہم روپا کو لینے آئے ہیں، ہم روپا۔۔۔۔''

اور پھر ایک دم منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں کہہ رہا ہوں۔ ''ہم لیکھا کو لینے آئے ہیں'' مجھے اس طرح دیکھ کر وہ ایک دفعہ پھر مسکرائی۔ بچے شور مچانے لگے۔ ''ہم نہیں کھیلتے، ہم نہیں کھیلتے''۔ اور ایک غدر مچ گیا۔ میں اور لیکھا ہنسنے لگے۔ مستری پیچ کش لے کر گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔ اور ''آئی۔سی، آئی۔سی۔'' کہتا ہوا پھر ایمپلی فائر پر ٹوٹ پڑا۔ لیکھا نے قہر آلودہ نظروں نے اسے دیکھا اور واپس چلی گئی، ننگے پاؤں۔ اور میں لٹکتے ہوئے وسل کو تکنے لگا۔

سامنے دیگیں پک رہی تھیں۔ کھانے پکانے کی چیزیں ادھر ادھر پھیلی ہوئی تھیں۔ دن کی روشنی میں آگ کی چمک اور لہسن اور پیاز کی کچی پکی خوشبو میں کچھ اس طرح مِل گئی تھیں کی ساری فضا پلاؤ کی ایک بڑی سی رکابی معلوم ہوتی تھی۔ چاولوں کو دم دے رکھا تھا۔ باورچی ٹین کی کرسی پر بیٹھا ہوا پستے کی ہوائیاں کاٹنے لگا۔ اس کے پاس ایک لڑکا کشمش صاف کر رہا تھا۔ دو اور لڑکے چینی کی رکابیاں گرم پانی کنھگال رہے تھے۔ وہ للچائی ہوئی نظروں سے کشمش کو دیکھتے اور حسرت سے اس لڑکے جو ہر دوسرے منٹ کے بعد دس پندرہ دانے منہ میں ڈال لیتا اور پھر اس پھرتی سے چباتا کہ دیکھنے والوں کو پتہ نہ چل سکے۔ اس نے اپنے سر کو دونوں گھٹنوں میں دبا رکھا تھا۔ باورچی نے پستے کی تھالی زمین پر رکھ دی اور ٹین کی کرسی کی پشت پر پل پڑا۔ وہ ذرا سی دیر کے لیے کسمسائی، چرچرائی اور پھر خاموش ہو گئی۔ ''اس دفعہ مسلم لیگ جیتے گی'' اس نے پھندنا پکڑ کر ٹوپی اپنے سر سے کھینچی اور اسے انگلی پر گھمانے لگا۔ ''کیا نام لیگ کا سب سے بڑا افر آیا تھا۔ ہماری تو ساری کی ساری برادری کا نام ادھر ہی دے گی۔ اپنے باپ دادا تو سالے ساری عمر بکتے ہی رہے ہیں۔ پر ہم سے تو وہ نہیں ہو سکتا کہ اتنے

رتبہ کے آدمی کی وہ نہ مانیں اور دُور پلی لے کر بھگت جائیں ادھر''۔۔۔۔اور پھر وہ ٹوپی کو انگلی پر گھماتے گھماتے اونگھنے لگا۔لڑکے نے دونوں ہاتھوں سے کشمش پر دھاوا بول دیا۔باورچی نے ایک دم آنکھیں کھول لیں۔''کھائے جا! سالے تیرے باپ کی گانٹھ سے تھوڑی جاتا ہے۔ پر مجھے یہ بتا زردے میں تیری ماں کا بھیجا ڈالوں گا۔لڑکے نے شرم سار ہو کر سارا سر گھٹنوں میں گھسیٹ لیا اور رکابیاں صاف کرنے والے کھلکھلا کر ہنسے اور دیر تک ہنستے رہے۔

ظہیر بھیا جعفری میں آئے۔مجھے اس طرح بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گئے۔''ارے تم یہاں ہو۔شادی میں کیا رونکھا چہرہ بنا رکھا ہے''۔ انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔''یہاں آئے ہو تو رومانس لڑاؤ۔ایسے موقعے ہر روز نہیں ملا کرتے۔۔۔۔کچھ ہے پریکٹس؟'' مجھے ان کی یہ بے وقت آمد بری معلوم ہوئی۔ہم چھم سے جو آجائے تو کیا ہو''۔سوچ رہے تھے اور وہ ''دھم سے'' آگئے۔''پریکٹس؟'' میں نے دہرایا۔''تھوڑی سی ہے۔ایف۔اے کے زمانے میں گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک دفعہ رومانس لڑایا تھا۔شدت کا ملیریا ہوا اور پھر پائیوریا ہو گیا۔پھر سے اس حرکت کی جرأت نہیں کی بلکہ تاب ہی نہیں''۔

وہ ہنسنے لگے اور سگرٹ طلب کیا۔بڑے ادب سے دو سگرٹ چیر کر انہوں نے تمبا کو کو اپنے پائپ میں رکھا۔دیا سلائی دکھائی اور چیریو کہہ کر چلے گئے۔

''لیکھا! لیکھا! وہ میری جعفری کے آگے سے پھسلی جا رہی تھی۔میری آواز سن کر ٹھٹکی اور جعفری کر قریب آگئی۔اس دفعہ اس کے پیروں پر دھول کی ہلکی سی تہہ تھی۔اس نے بند ہوتی ہوئی چھوئی موئی سے مجھ کو دیکھا۔

وہ جانے لگی تو میں بے چین ہو گیا۔''بس؟'' میں بولا اور جیب سے سگرٹ نکال کر سلگا دیا وہ ٹھہر گئی۔''یہ سلیٹی پنسلیں نہ چھٹ سکیں آپ سے۔پتہ نہیں ان میں کیا مزا ہے'' یہ کہہ کر وہ چل دی اور پھر نہ رکی۔نہ ہی میں نے روکا۔مزے سے سگرٹ پیے گیا۔

ایک کھڑکی آدھی کھلی تھی۔اس میں سے ملی جلی آوازیں آ رہیں تھیں۔میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔دونوں دلہنیں گھٹڑیاں بنی پڑی تھیں۔لیکھا زمین پر بیٹھی دو تین لڑکیوں سے مٹھار مٹھار کر باتیں کر رہی تھی۔''چل'' ایک لڑکی نے جواب دیا۔شاید لیکھا نے کچھ کہا تھا۔''دفان ہو مردار''۔وہ لڑکی پھر چلائی۔اس دفعہ بھی مجھے لیکھا کے الفاظ سنائی نہ دیے۔''اچھاری! اب ہمیں دفان ہونے کو کہتی ہے۔'' اب کے اس کی آواز صاف سنائی دی۔لے بھئی ناراض ہو گئی ہو''۔اس لڑکی نے چمکار کر کہا۔''دفان کے معنے پتہ ہے کیا ہیں؟ سنو! اس کا مطلب ہے۔خدا کرے تمہارا بیاہ جلدی ہو اور تم اپنے خاوند کے ساتھ فوراً چلی جاؤ۔''

واہ ری میری مٹکو! اپنی اس نئی ڈکشنری کو کب شائع کرو گی؟'' لیکھا نے پوچھا اور وہ ہنستی ہوئی اس کے گلے سے چٹ گئی۔میں آج تک دفان کے معنی غلط ہی سمجھتا رہا تھا۔

اگلے دن بڑی چہل پہل تھی۔لاؤڈ سپیکر کچھ ٹھیک ہو گیا تھا اور دن بھر گلا پھاڑتا رہا۔سنجوک کا گانا ''اک دل والا اور اک دل والی دونوں یہ مل مل گاتے ہیں'' اتنی دفعہ بجایا گیا کہ آخری دفعہ تو پتا ہی نہ چل سکا کہ کون کیا گاتا ہے۔برآمدے کے ساتھ ساتھ اور سرخ بجری بچھا دی گئی۔شامیانے کے چاروں طرف ہرے پیلے بلبوں والا ''ویل کم'' لٹکا دیا گیا۔دیگوں کے پاس شاگرد پیشہ لوگوں کا اضافہ ہو گیا۔اور

کرسیاں اور صوفے منگائے گئے۔ رات کو نکاح تھا۔ دو دل والے اور دو دل والیاں ملائی جا رہی تھیں۔ میں جعفری کے جھروکوں میں سے سب کچھ دیکھا کیا۔ ریشم میں لپٹی ہوئی ایک مانوس سی بلی لڑکی سب کی نگاہوں کا مرکز ہوئی تھی۔

کندھے پر منی بیگ لٹک رہا تھا۔ کلائی پر منی سی گھڑی۔ ناک پر بغیر فریم کی چکور شیشوں والی عینک، ناخن خون آلودہ اور سر کے بال کسی خوفزدہ نیولے کی دم کی طرح اٹھے ہوئے تھے۔ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آتی۔ وہاں سے شامیانے اور برآمدے کی درمیانی جگہ ذرا ٹھیرتی اور واپس اندر چلی جاتی۔ پھر نکلتی اور کچھ اس انداز سے کہ پہلی بار باہر آ رہی ہے۔ ذرا رک کر، لچک کر اور منہ بنا کر۔

جب وہ گیارہویں دفعہ برآمدے میں آئی تو ظہیر بھیا جعفری کی اوٹ میں سے، ارشاد گرم پانی کے حمام کی طرف سے اور منیر برآمدے کے پرلے کونے سے جہاں چق لٹک رہی تھی اس کی طرف ایک دم بڑھے۔ جب ایک دوسرے کے سامنے آئے تو تینوں شرما گئے۔ ذرا کھانسے، پپوٹے جھپکائے اور آپس میں ہاتھ ملا کر ہنسنے لگے۔ وہ ان کے پاس سے گزر کر باہر اپنی جگہ پر ٹہلنے لگی۔ ان میں سے کسی کو بھی اس کے گزرنے کا احساس نہ ہوا۔ سب نے یہی ظاہر کیا۔

دلہنوں کے کمرے میں دو بنگالی لڑکیاں ایک دم اٹھ کر ناچنے لگیں۔ کھڑکی میں سے ان کے گھنگھروؤں کی جھنکار اور ٹیگور کے گانے ''ایکا چولو، ایکا چولو'' کی آواز جعفری سے بہر نکلی۔ اس آدھ کھلی کھڑکی سے موسیقی پرانی چھت کی طرح ٹپک رہی تھی۔

رات چھائی اور شامیانے سے قرنات بلند ہوئی۔ دودھ سی چاندنی، اس پر بے شمار بلب، پھولوں سے لدے، دونوں دولہا براتیوں کے درمیان گیندے کے ڈھیر دکھائی دیتے تھے۔ قاضی صاحب سورتوں پر سورتیں پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اب میں بھی اپنی جعفری میں رہا۔ چاند اور بلبوں کی ملی جلی روشنی جعفری میں منعکس تھی۔ نہ بہت اندھیرا تھا نہ چندھیانے والا اجالا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چاند پر سرمئی چادر ڈال کر اس کی روشنی سے دیواروں پر سفیدی کر دی گئی ہو۔ میں بوٹوں اور کوٹ سمیت چارپائی پر دراز تھا۔ رضائی عرضاً اوڑھ رکھی تھی۔ منہ اور پاؤں ننگے تھے۔ ابھی ایک سگرٹ پیا تھا اور ابھی ایک اور پینے کو جی چاہتا تھا کی دروازے کے پاس ایک سایہ جھلملایا۔ لیکھا ہی تو تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ آہستہ سے اندر داخل ہوئی۔ مجھے لیٹا دیکھ کر گھبرا گئی۔ پھر آگے بڑھی، چارپائی کے قریب آ کر ذرا جھکی اور پھر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ ''دو بھائیوں کا نکاح ہو رہا ہے اور جناب یہاں بوٹ سوٹ پہنے سو رہے ہیں''۔ ہولے سے کھانس کر اس نے منہ میں یہ کہا اور پھر تپائی کی طرف دیکھنے لگی۔ لٹکتے ہوئے دوپٹے کو کندھے پر پھینک کر اس نے سگرٹ کی ڈبیا اور ماچس اٹھائی اور ایک سگرٹ نکالا اور دیا سلائی جلا کر سگرٹ سلگانے لگی۔ اس ننھی سی لو میں اس کا چہرہ میں نے آنکھ نی جھری میں سے دیکھا جیسے الحمرا کے کسی بڑے دالان میں ایک بجھی ہوئی موم بتی کے آگے کوئی لیکھا الف لیلہ پڑھ رہی ہو۔ ایک چھوٹا سا کش کھینچ کر اس نے کلے پھلائے اور پھر فوراً سانس چھوڑ دیا۔ ذرا سی دیر مجھ کو دیکھا اور پھر ایک اور کش لیا اور ذرا سا جھک کر سارا دھواں میرے منہ میں دھکیل دیا۔ شاید ایک دفعہ پھر ایسے ہی ہوتا مگر نکاح کے چھوہارے اوپر شامیانے کی چھت سے جا ٹکرائے۔ مبارک باد کی صدا بلند ہوئی۔ باجا زور سے بجا۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ سٹ ٹپاتی جلتا ہوا سگرٹ تپائی پر پھینک کر برآمدے میں بھاگ

گئی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ اس دھندلی روشنی میں بجری کے غالیچے پر ننگے پاؤں کے تین نشان بے ترتیب بوسوں کی طرح پڑے تھے۔ میں نے

پتائی پر سے سلگتا ہوا سگرٹ اٹھا کر اسے دیکھا۔ کارک والی جگہ گیلی تھی۔ اسے ہونٹوں میں دبایا۔ کش نہیں کھینچا اور پھر سگرٹ بجھا دیا اور رومال میں لپیٹ کر کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ پھر پاسنگ شو کے باقی ماندہ سگرٹ معہ ڈبیا مروڑ تروڑ کر جعفری کے موکھے میں سے دُور دور تک پھیلی ہوئی دودھیا چاندنی میں پھینک دیے۔

فہیم

باہر بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی۔ برساتی نالوں کا شور بڑھ گیا تھا اور سیٹیاں بجاتی ہوئی ہوا چنگھاڑنے لگی تھی۔ بادل شدت سے دھاڑا۔ بجلی کا ایک کوندا تیزی سے لپکا اور پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر چیل کے ایک جھنڈ سے ایسے پٹاخے چھوٹے گویا مشین گن چل رہی ہو۔ پروین نے لحاف اپنے منہ پر کھینچ لیا۔ سلیم اور نعیم جو ایک ہی بستر میں لیٹے ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے ایک دم خاموش ہو گئے اور شڑاپ شڑاپ کرتی دھاروں کے درمیاں عجیب ان ہونی سی چیخیں سننے لگے۔ پھر ایک زور کا دھماکہ ہوا اور برستی بوندوں میں بہت سے درخت دھڑام سے گرے۔

''کیا ہوا باجی؟'' فہیم ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کچھ نہیں بجلی گری ہے۔'' پروین نے اپنے خوف کو دباتے ہوئے کہا۔

''بجلی؟ کہاں گری۔ باجی؟'' فہیم نے پھر پوچھا۔

''قریب ہی گری ہے۔۔۔ مگر تم سو رہو یار''۔ اس دفعہ باجی کے بجائے سلیم نے جواب دیا۔ وہ چپکا ہو کر لیٹ گیا۔ مگر اس کے دل میں خوف ابھی کروٹیں لے رہا تھا۔ بجلی کیوں گرتی ہے؟ کہاں گرتی ہے؟ کیسے گرتی ہے؟ گھروں پر تو نہیں گرتی؟ بہت سے سوال ایسے تھے جن کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ شاید کوئی بتا دے اس کے ننھے سے دل میں امید کی چھوٹی سی کرن راستہ بھولے ہوئے جگنو کی طرح ٹمٹمائی اور پھر ایسے ہی جلتی بجھتی خاموش ہو گئی۔ نسرین زانوؤں کو پیٹ میں دیے گھوک سو رہی تھی اور اس کے الجھے ہوئے بدبودار بال ناک کے نتھنوں پر سانس کی آمد و رفت کے ساتھ ساتھ ویلو کی طرح کھلتے چمٹتے اور پھر الگ ہو جاتے۔ فہیم نے اس کا گرم گرم سانس اپنی ٹھنڈی ناک پر محسوس کیا اور پرے ہٹ گیا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ نسرین کے بال جڑ سے اکھاڑ کر تکیہ کے نیچے دے دے مگر سوئے ہوئے پر حملہ کرنے کو اس کا دل نہ مانا۔

بارش ذرا تھمی تو ژوں ژوں کرتی ہوا کی تیزی میں اضافہ ہو گیا۔ پروین نے لحاف سرکا کر نانی اماں کی طرف دیکھا جو چوکی پر بیٹھی ہونٹوں کو جلدی جلدی جنبش دیے جا رہی تھیں۔ ان کی یخ بستہ اور مڑی ہوئی انگلیاں تسبیح کے دانوں سے کھیل رہی تھیں۔ ایک دانے پر دوسرا دانہ ایسے گرتا جیسے آنسو کے بعد آنسو۔ آتشدان میں دہکتے ہوئے کوئلوں پر سفیدی کی ایک تہہ چڑھ چکی تھی اور وہ بوڑھے مینڈکوں کی طرح ہانپ رہے تھے۔ بلب کے گرد چکر لگانے والا ایک بڑا سا پتنگا بار بار شیڈ سے ٹکراتا اور ہلکا سا ارتعاش پیدا کر دیتا۔ کبھی ہوا اپنا رخ بدلتی تو بارش کی نوجوان اور سڈول بوندیں باغ میں کھلنے والے دریچوں کے شیشوں پر چھن چھن شن شن جھنیاں بجانا شروع کر دیتیں۔

''ہٹاؤ یا اپنی ٹانگ''۔ سلیم نے جھلا کر کہا۔ ''پھر میرے اوپر ڈال دی''!

''کہاں لے جاؤں اسے؟'' نعیم نے تنک کر پوچھا۔ ''جگہ بھی تو ہو''۔

''جگہ تو کافی ہے ادھر'' سلیم اٹھ کر بیٹھ گیا اور چارپائی کے اس طرف ہاتھ پھیرنے لگا۔

''ادھر جگہ ہے تو تم ادھر آ جاؤ'' نعیم نے غصے اور نفرت کے ملے جلے جذبات سے کہا۔

''اچھا'' سلیم مان گیا اور انھوں نے جگہ بدل لی۔ پروین کا لحاف اب کھسک کر کندھوں تک آ گیا اور اس نے اپنے پپوٹوں کو تیزی سے جھپکنا شروع کر دیا تا کہ سارا خوف کڑوی کسیلی دوا کی طرح بہہ جائے۔ سلیم نعیم کی چارپائی اور اس کی پلنگڑی کے درمیاں نانی اماں کی کھاٹ حائل تھی جس کے سرہانے لوہے کے سپرنگ دار پلنگ پر فہیم اور نسرین لیٹے ہوئے تھے۔ تسبیح کو گردش رکی۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھے اور پھر چہرے پر پھر گئے۔ نانی اماں بستر پر بیٹھیں اور پھر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ طاق سے دیا سلائی اٹھا کر انہوں نے دروازہ کھولا۔ ہوا کا سرد جھونکا اندر لپکا اور حجامت بنانے والے بلیڈ کی طرح سب کے کانوں پر پھر گیا۔

''اوئی اللہ۔۔۔ نانی اماں بھی کمال کرتی ہیں''۔ پروین نے پھر لحاف سر پر کھینچ لیا۔ فہیم نے یہ دیکھنے کے لیے کی نانی اماں نے کیا کمال کیا ہے جھٹ اپنا لحاف اٹھا دیا مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ نہ ہی نانی اماں نہ کمال! سب کو رضائی میں منہ چھپائے دیکھ کر اسے بہت حیرت ہوئی۔ سامنے باورچی خانہ میں نانی اماں دیا سلائی جلائے ادھر ادھر کچھ دیکھ رہی تھیں۔ صحن میں برستی ہوئی بوبدوں میں سے دیا سلائی ڈبڈبائی آنکھ کی طرح جھلملاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ فہیم کو ایسے لگا جیسے کوئی نیک دل پری بوڑھی ملکہ کا بھیس بدل کر ان کے گھر اسفنج کیک رکھنے آئی ہو۔ جب وہ آ کر دوبارہ اپنے بستر پر لیٹ گئیں تو سب نے سوائے فہیم کے اپنے چہرے رضائی سے نکال لیے۔

''یار تیری یہ ٹانگ پھر ادھر آ گئی''۔ سلیم نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں کیا کروں پھر؟'' نعیم غصے سے بولا۔

''کرنا کرانا کیا ہے اسے اپنے پاس ہی رکھو''۔

''اپنے پاس ہی تو ہے۔''

''اپنے پاس تو نہیں''۔

''نہیں تو نہ سہی''۔

''نہ سہی کا کیا مطلب؟''

''مطلب کیا ہونا تھا۔ وہی جو ہوتا ہے''۔

''جنگی'' آغا صاحب دوسرے کمرے سے فوجی انداز سے دھاڑے۔ کیا بات ہے؟''

''سلیم بھائی خوامخواہ تنگ کر رہے ہیں''۔ نعیم نے بسور کر کہا۔

''یہ جھوٹ کہتا ہے ابا جی''۔ سلیم کی نسوانی آواز بڑی مشکل سے آغا صاحب تک پہنچی''۔ بار بار اپنی ٹانگ میرے اوپر ڈال دیتا ہے۔''

''مگر ابا جی۔۔۔۔''

''شٹ اپ مگر ابا جی کا بچہ''۔ کمرہ گونجا مگر اور ابا جی کا بچہ خاموش ہو گیا۔

''نا بیٹا لڑا نہیں کرتے''۔ نانی اماں نے کہا۔ ''بھائی بھائی تو محبت پیار سے رہتے ہیں''۔

''سلیم بھائی ہمیشہ اسی طرح کرتے ہیں۔''نعیم نے روکر کہا۔

''تم تو خوامخواہ رونے لگتے ہو یا جنگی۔ذرا اپنی اس ٹانگ کو اپنے پیٹ پر تو لٹا کر دیکھو۔موگری ہے موگری۔''

اس تشبیہہ پر نعیم ایک دم ہنس دیا اور غیر ارادی طور پر اس کی ٹانگ سلیم کے پیٹ پر جا ٹکی۔

''بھائی جان تم میرے ساتھ سو جاؤ''۔پروین نے سلیم کو مشورہ دیا۔

''نا تیرے ساتھ کیوں سو جائے''۔نانی اماں چمک کر بولی۔''بھائی بھائی جھگڑا ہی کرتے ہیں۔۔۔تمھارا نانا اور اس کے بھائی ایک دوسرے سے جھگڑتے ہی تو رہے''۔

''کیوں نانی اماں''۔پروین نے حیران ہو کر پوچھا۔

''بس ایسے ہی، بھائی جو ہوئے۔۔۔دراصل جھگڑا تو میری وجہ سے چلتا تھا۔

بابو بھائی، خدا اسے جنت نصیب کرے۔بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس کی روح کو ثواب پہنچے، ہمیشہ میری ہی طرف داری کرتا تھا۔تمہارا نانا، خدا اسے کروٹ کروٹ جبت نصیب کرے، فقیر تھا۔۔۔''

''فقیر؟''فہیم بھونچکا ہو کر اٹھ بیٹھا۔

''ہاں بیٹا۔۔مگر یہ فقیر نہیں جو گلیوں میں مارے مارے پھرا کرتے ہیں۔''نانی اماں نے فقیر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''مگر تم ابھی تک جاگ رہے ہو فیمو بیٹا؟''

''ہوں''۔کہہ کر فہیم پھر لیٹ گیا اور رضائی کے درّے سے چپٹی ناک والا چہرہ نکال کر غور سے نانی اماں کی باتیں سننے لگا۔

''۔۔۔طبیعت کے بادشاہ تھے تمھارے نانا۔دل میں کسی چیز کی ٹھان لی تو پھر اسے پورا کر کے ہی دم لیا۔ہم لاکھ سر ماریں، منتیں خوشامد میں کریں، طعنے الہنے دیں مگر وہ وہی کچھ کرتے جو انہیں پسند ہوتا۔گڑھ شنکر میں نائب تحصیلدار تھے۔اتنی بڑی حویلی دو بھیسیں ایک درویش آئے ہیں جو کہتے ہیں پورا کر دکھاتے ہیں۔کسی سے ملتے نہیں۔کسی کو مرید نہیں بناتے۔وہ تو ایسی باتوں کے دل سے خواہاں تھے۔جھٹ استعفےٰ لکھ بھیجا۔صاحب بہادر نے بہت روکا مگر نہ مانے۔تار بھیج کر تمھارے نانا اکبر کو بلایا اور مجھے اس کے ساتھ گاؤں بھیج دیا۔میں نے لاکھ منتیں کیں۔ہاتھ جوڑے۔اللہ رسول کا واسطہ دیا مگر ان کا دل ہمارے تمہارے ایسا ہوتا تو مانتے۔میں نے کہا''اس موئے بتانے والے سے کوئی پوچھے۔''تجھے علی کی سنوار جب وہ کسی سے ملتا نہیں تو اس کی کرامتوں کا پتہ کیسے چلا؟''مگر تمہارا نانا بھی ایک ہی ضدّی تھا۔کہنے لگا''کاملوں کی کراماتیں بھلا چھپ سکتی ہیں؟تم تو پگلی ہو۔۔۔بجائے خوش ہونے کے خفا ہوتی ہو۔وہاں جا کر آخرت کا توشہ مہیّا کروں گا۔درویش کی خدمت گذاری اس ملازمت سے بدرجہا اچھی ہے۔سرکار کی نوکری کا جل کی کوٹھڑی ہے اور اس میں دھبّہ لگنے کا ڈر لگا ہی رہتا ہے''۔۔۔میں اس خبر لانے والے، استعفےٰ منظور کرنے والے اور تمہارے نانا کو کوستی وہاں سے چل دی کہ پاک پروردگار ان سب پر

میرا صبر پڑے۔۔۔''

''نانا جی پر کیوں؟''فہیم نے پوچھا تو سب ہنس پڑے۔

''یار تم سور ہو۔''سلیم نے اسے مشورہ دیا۔''خواہ مخواہ میں نیند حرام کرتے ہو۔''

''پھر وہ کامل ہو کر آئے نانی اماں؟''پروین نے پوچھا۔

''خاک! کامل کہاں سے ہوتے جو کچھ پاس تھا۔ وہ کانا درویش لے گیا۔۔۔ان موئے کانوں کی ایک رگ سوا ہوتی ہے نا۔کھا پی سب کچھ ہضم کر کے راتوں رات نو دو گیارہ ہو گیا۔تمہارا نانا شامت کا مارا پیدل چلتا گھر پہنچا۔اس کی حالت دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ بڑی ہوئی مونچھیں،کھلیان ایسی ڈاڑھی۔مسلسل فاقے کاٹنے سے پیلی سا منہ نکل آیا تھا۔پھٹی ہوئی قمیص سے کھوے باہر جھانک رہے تھے''۔۔۔فہیم نے اپنی کندھوں سے پھٹی قمیص کو ٹھوڑی سے دبالیا۔۔''میاں جی،اللہ ان کی قبر نور سے بھری رہے،تمہارے نانا پر بہت برسے۔''فہیم نے گردن پھرا کر باہر برستی ہوئی بوندوں کو سنا اور پھر متوجہ ہو گیا۔''کہتے تھے تمہیں اپنی جائیداد سے عاق کر دوں گا۔ جب تک زندہ ہوں اس گھر میں تو کیا اس گاؤں میں بھی قدم نہ رکھ پاؤ گے۔ یاد رکھو تم نے میری بہو اور معصوم بچی کو تنگ کیا ہے۔۔۔''

''معصوم بچی کون،نانی اماں؟''پروین نے پوچھا۔

''اے تمہاری بڑی خالہ بیٹی!''نانی اماں نے جواب دیا۔''وہ چھوٹی سی تو تھی۔ابھی پاؤں چلنا سیکھا تھا کہ آنکھیں دکھنے آ گئیں اور جب وہ ذرا۔۔۔۔۔۔

''کیا کتھا چھیڑ رکھی ہے،تائی جی؟''دوسرے کمرے سے آغا صاحب کی آواز رعد کی طرح کڑکی۔''بچوں کو سونے دیجیے۔آدھی آدھی رات تک جگائے رکھتی ہیں اور پھر صبح۔۔۔''

''نا! نا! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ماں کا دل میلا ہو جائے گا۔''آغا صاحب کی بیوی نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔پھر وہ آپس میں جھگڑنے لگے۔فہیم نے اپنا چہرہ رضائی کے اندر کھینچ لیا۔''اللہ کرے۔۔۔اللہ کرے ابا جی''۔۔۔۔اسے کوئی مناسب بددعا سوجھ نہ سکی کیوں کہ آغا صاحب اسی شام بارش ہونے سے چند گھنٹے پہلے اس کے لیے کل کا ایک فوجی سپاہی لائے تھے۔جو کوک بھرنے سے اپنی سیاہ بندوق ادھر ادھر گھماتا تھا۔

''پھر کیا ہوا،نانی اماں؟''نعیم نے آہستہ سے پوچھا۔

''نا بابا،تمہارا ابا ناراض ہوتا ہے۔۔۔اب سو جاؤ۔''نانی اماں نے دکھے دل سے کہا۔

''ابا جی تو ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہیں۔۔۔ابا جی کے بچے۔''پروین نے نفرت سے کہا اور نانی اماں کا کندھا ہلا کر کہنے لگی۔''سنایئے!سنایئے!!نانی اماں ہولے ہولے،چپکے چپکے۔''

''یار نعیم،ذرا پرے رہ۔''سلیم نے درخواست کی۔''تجھ سے تو پھٹیس کے کٹڑے کی سی بو آتی ہے۔''

''اور گلاب کا عطر تو میرے خیال میں تیرے پسینے کو شیشی میں بند کرنے سے بن جاتا ہے نا۔''نعیم بنھا کر بولا۔

''بے شک۔''

اور جب نعیم کو کوئی جواب نہ سوجھا تو وہ اور نزدیک ہو گیا۔ ''لے میں تو ایسے ہی سوؤں گا۔ کر لے جو کچھ کرنا ہے۔''

''دیکھو، نانی اماں۔'' سلیم منمنایا۔

''نا بیٹا، جھگڑو نہیں۔ تمہارا باپ تو کمرہ سر پر اٹھالے گا۔''

فہیم نے یہ سنا تو لحاف کھسکا کر کمرے کی چھت دیکھنے لگا۔

''میرے اتنے بچے ہوئے۔'' نانی اماں نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''مگر تمہارے نانا نے کبھی ان کو پھول کی چھڑی تک نہ ماری۔ کہا کرتے تھے بچے تو فرشتے ہوتے ہیں، ان کو مارنا گناہ ہے۔ تمہاری کراچی والی خالہ دن بھر محلّہ کی تیلنوں اور جولاہی سہلیوں سے کھیلتی رہتی اور جب شام کو گھر واپس آتی تو کپڑے میلے، چیکٹ اور جھونٹوں میں من من خاک۔ میں وسپنا لے کر مارنے لگتی تو گود میں اٹھا کر باہر نکل جاتے۔ میں کہتی تم اسے خراب کر دو گے تو الٹا مسکرانے لگتے کہ فرشتے کبھی خراب نہیں ہوتے۔۔۔۔ ان کے پاؤں میں چکر تھا۔ تین مہینہ سے زیادہ گھر پر نہیں ٹھیرے۔ باہر دیوان خانے میں بیٹھے بیٹھے دل میں جانے کیا آتا۔ منہ اٹھا کر چل دیتے۔ یہ نہیں پتہ کہاں جا رہے ہیں۔ کب آئیں گے کچھ پاس ہے کہ نہیں۔ بیوی بچوں کے لیے بھی کچھ چھوڑ کر جا رہے ہیں یا نہیں۔ میں نے بیسیوں مرتبہ کہا کہ لڑکیوں کے لیے کیا سوچ رکھا ہے۔ آخر پرایا دھن ہے۔ کچھ دے کر ہی جان چھٹے گی۔ مگر ان کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ مسکرا کر یہی کہتے۔ ''تم جانو اور تمہارا بیٹا۔ جب آنکھ بند کر لی، پیچھے کچھ ہی ہو۔ میں رونے لگتی تو مجھے دلاسا دے کر کہتے۔ ''خوامخواہ پریشان ہوتی ہو۔ اللہ مالک ہے۔ جس نے چونچ دی وہ چوگا بھی دے گا''۔۔۔۔۔ خدا بخشے میری ساس ذرا سخت طبیعت کی تھی۔ گھر کا سارا کام کاج مجھے ہی کرنا پڑتا۔ باقی سب بہوؤں کے گھر والے تو ساتھ رہتے تھے۔ ذرا بھی تنگی ترشی ہوتی۔ ٹسوئے بہاتیں۔ ان سے جا لگاتیں۔ مجھ بے چاری کا کون تھا جس پر بھول بیٹھتی۔ عمر بھر نوکر بن کر ان کی خدمت کی۔ دن بھر مکئی کا آٹا گوندھتے گوندھتے میری کلائی ٹیڑھی ہو گئی۔'' نانی اماں نے لحاف سے اپنا ہاتھ باہر نکالا تو فہیم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پروین نے کہا۔ ''ہائے اللہ! واقعی نانی اماں کا ہاتھ ٹیڑھا ہے۔''

''دکھانا! دکھانا!!'' سلیم اور نعیم ایک دم بول اٹھے اور نانی اماں نے اپنا ہاتھ ادھر بڑھا دیا۔ جب وہ دیکھ چکے تو فہیم نے آہستہ سے کہا۔

''میں بھی دیکھوں نانی اماں۔'' مگر نانی اماں اسے بستر میں چھپا لیا تھا۔

''اور تو ابھی تک جاگ رہا ہے۔'' نعیم نے پوچھا۔ ''سوجا، کیا کرے گا دیکھ کر۔''

''سوجا، میرے لال۔'' نانی اماں نے چمکار کر کہا۔ ''مجھے ٹھنڈ لگتی ہے۔''

''یہ کیا گڑبڑ ہے۔۔۔۔ ہیں؟'' آغا صاحب کا بادل پھر گرجا۔ ''حرام زادو! ساری رات جاگتے ہو اور صبح مُردوں کی طرح اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ پھر ان کی ان کی بیوی کی تکرار شروع ہو گئی۔

''بیٹا، یہ بتی گل کر دو'' نانی اماں نے سلیم سے کہا اور خود منہ ہی منہ میں کوئی آیت پڑھنے لگی۔ سلیم نے بستر پر کھڑے ہو کر بتی بجھائی تو

باہر سے ٹھٹھرتا ہوا اندھیرا اندر سمٹ آیا۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشے دھندلے دھندلے ہو گئے۔ گوان میں سے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ تاہم ایسے لگتا تھا کہ ابھی کچھ دکھائی دینے لگے گا۔ آتش دان میں پڑے ہوئے کوئلوں کی چمک بڑھ گئی اور بوندوں کی ٹپاٹپ میں اضافہ ہو گیا۔ سب نے یوں محسوس کیا جیسے بتی بجھانے سے سردی بڑھ گئی ہے اور ہر ایک نے اپنا لحاف اپنے گرد اچھی طرح سے لپیٹ لیا۔ فہیم اور نسرین کا لحاف بہت پتلا تھا۔ اس وجہ سے ان پر ایک کمبل ڈالا ہوا تھا جو آہستہ آہستہ کھسکتا جا رہا تھا۔

''ایسی ہی سرد رات تھی'' نانی اماں نے کہنا شروع کیا'' جب تمہارا نانا گھر سے نکل کھڑا ہوا اور بہت دُور نکل گیا۔ اندھیاری رات، تیز بارش اور قدم قدم پر گہری کھڈیں۔ مگر وہ چلتا رہا اور چلتا رہا۔ اچانک اسے باؤلی لومڑی کے چلانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس کسم پرسی کی حالت میں نا پاس لاٹھی تھی نہ لکڑی۔ توکّل کے سر پر چلتا رہا۔ آنکھیں بند کیے، اللہ سے لو لگائے کہ ایک دم باؤلی لومڑی نے پنڈلی پر کاٹ کھایا۔۔۔۔''

''پھر؟'' فہیم نے تڑپ کر پوچھا۔

'' یار سنو تو سہی۔'' سلیم نے دوستانہ طور پر کہا۔'' خواہ مخواہ بیچ میں اپنی ٹانگ اڑا دیتے ہو۔''

''ہاں بیٹا، تو چپکے رہ کر سنے جا۔ بڑوں کی باتوں کو ٹوکا نہیں کرتے۔'' نانی اماں نے اسے آداب سکھاتے ہوئے کہا۔

''اچھا پھر، نانی اماں؟'' سلیم نے پوچھا۔

''پھر کیا۔۔۔۔تمہارے نانا فوج میں صوبیدار رہ چکے تھے۔ لپک کر اسے گردن سے پکڑ لیا۔ کلّوں میں انگلیاں ڈال کر جو زور لگایا تو گردن تک چیر کے رکھ دیا۔ پھر ایک جبڑے پر پاؤں رکھ کر تھوتھنی ہاتھ میں پکڑ کر جو ایک جھٹکا دیا تو لومڑی دو حصّوں میں چیر کر رکھ دی۔ اندھیرے میں اس کا کلیجہ نکال کر چبا گئے۔'' ''کیوں؟'' نعیم نے پوچھا۔

''باؤلی لومڑی کاٹ کھائے تو اس کا علاج یہی ہے کہ اس کا کلیجہ کھا جاؤ۔''

''کچا ہی کھا لیا؟'' فہیم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''ہاں یار، کچا ہی۔'' سلیم نے تر شرد ہو کر جواب دیا۔'' میں پوچھتا ہوں تم سوتے کیوں نہیں۔'' وہ پھر چپکا ہو گیا۔ تو سلیم نے نعیم سے ملتجیانہ لہجہ میں کہا۔'' یار، اب تو اٹھا لے اپنا زانو میری تو ٹانگ بھی جھنانے لگی ہے۔''

''لے بابا لے۔۔۔۔بس؟'' نعیم نے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔۔بس۔۔۔۔۔مہربانی۔''

''نانی اماں، لومڑیاں یہاں بھی ہوتی ہیں؟'' پروین نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

''نہیں بیٹی، یہاں نہیں ہوتیں۔ یہاں تو صرف بندر ہی ہوتے ہیں۔'' نانا نانی اماں نے تسلی آمیز لہجہ میں جواب دیا۔

''بندر تو ہوتے ہیں پر۔۔۔۔اچھا۔۔۔۔'' پروین نے خود ہی فقرہ بیچ میں چھوڑ دیا۔

''پر کیا باجی؟'' فہیم نے ہولے سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' پروین نے جواب دیا۔

''یہ حضرت جی آج نہیں سوئیں گے۔'' نعیم نے طنز کی۔ فہیم چپکا ہو رہا اور نسرین کو پرے دھکیل کر پہلو کے بل لیٹ گیا۔

''جب بھی تمہارے نانا باہر سے آتے کوئی تحفہ ضرور لاتے۔'' نانی اماں کو اچانک پھر خیال آیا ''کبھی کسی فقیر کو ساتھ لے آتے۔ کبھی کوئی خوبصورت کتا اٹھائے چلے آتے۔ کبھی کسی غریب عورت کو بال بچوں سمیت گھر میں لا بٹھایا کہ ان کی خدمت کرو میں کما کر لاؤں گا۔ پھر جب تک وہ عورت رہتی نوکری ضرور کرتے۔ اس کے بچوں کے لیے کپڑے بنواتے انہیں پڑھواتے اور جب کوئی اور وسیلہ اپنے سے بہتر ان کے لیے دیکھتے انہیں وہاں جانے کی تلقین کرتے۔ کشمیر سے ڈھائی تین سو روپیہ کما کر لائے اور راستہ میں ایک گائے خرید لی۔ من موہنی رنگ برنگی ننھے ننھے سینگوں والی۔۔۔۔''

''جیسی کراچی والی خالہ کے پاس ہے۔'' فہیم نے خوش ہو کر پوچھا۔

''بھئی فہیم، بات تو سننے دو یہ کیا بدتمیزی ہے۔'' پروین نے جل کر کہا۔

''ہاں ویسی ہی۔ بلکہ اس سے بھی خوب صورت۔۔۔۔۔ آتے ہی زنانہ کرویا اور کھونٹے گڑھوانے لگے۔ جب گائے بن چکی تو ہم سب دیکھنے آئے، سنہری جسم کی، اس پر سفید دھبے۔ تمہارا ماموں نذر اس وقت چھوٹا ہی تھا۔ خوش ہو کر بولا جب مرے گی میں اس کی کھال سے اتنی ساری جوتیاں بنواؤں گا۔ ہنس کر کہنے لگے، دیکھ لو جی اپنے بیٹے کے ڈھنگ، ہماری گائے کی موت کی دعا مانگ رہا ہے۔''

''نانی اماں۔'' فہیم نے اٹک کر پوچھا۔ ''کتّے کے چمڑے سے بوٹ نہیں بنتے۔'' اسے جون صاحب کا کتا یاد آ گیا۔ جو کل مرا تھا اور جسے انہوں نے ''بمہ'' کھال کھڈ میں پھینک دیا تھا۔

''یار جنگی! کل فیمو کا بوریا بستر یہاں سے اٹھواؤ۔'' سلیم نے تنک کر کہا۔ فہیم سہم گیا اور اپنی دونوں ٹانگوں کو کھینچ کر پیٹ سے لگا لیا۔

''وہ اتنا عرصہ سرکاری نوکر بھی رہے۔ تجارت بھی کی۔ دوسری ملازمتیں بھی کیں۔ مگر سوائے فوج کے کبھی بوٹ نہ پہنے۔ میری خواہش تھی کی وہ بھی دوسرے بھائیوں کی طرح ٹھپ ٹھپ کرتے چلیں۔ آخر کون سی کمی تھی ان میں مگر وہ نہیں مانے۔ یہی کہتے رہے، بوٹ پہن کر آدمی مغرور ہو جاتا ہے۔ اس کی اونچائی اور آواز انسان کے دل میں تکبّر پیدا کر دیتی ہے۔ میں اور سارے کام کرنے کو تیار ہوں پر بوٹ نہیں پہنوں گا۔۔۔''

فہیم نے سپرنگ دار پلنگ سے لٹک کر اپنے بوٹوں کو نانی اماں کی چارپائی کے نیچے دُور دھکیل دیا۔

''اور اس گائے کا کیا بنا، نانی اماں؟'' پروین نے پوچھا۔

''بننا کیا تھا۔ کاغذ کی مورت سے گھر سجا کر رکھ دیا۔ میں بالٹی لے کر دوہنے لگی تو لات مار کر دُور ہٹ گئی۔ بھوکی سمجھ کر چارہ ڈالا۔ وہ اس کے کھانے میں مشغول ہوئی اور میں نے موقعہ جان کر اسے دوہنا شروع کیا۔ لاکھ تھن دباتی پانی لگاتی مگر وہ بند نلکے کی طرح سوں کر کے وہیں رہ جاتے۔ شام کو آئے تو میں نے پوچھا خریدتے وقت دوہ کر نہیں دیکھی تھی۔ منہ ڈھیلا کر کے کہنے لگے۔ دودھ کے لیے تھوڑی خریدی

ہے۔خوب صورتی کے لیے سودہ کیا ہے۔میں خون کے گھونٹ پی کر چپ ہو رہی۔انہیں کون سمجھاتا۔۔۔جب وہ اگلے دورے پر گھر سے نکلے تو میں نے اسے بیس روپیہ میں بیچ دیا۔

''دوئے صفر بیس!''فہیم نے آہستہ سے کہا۔مگر اب کے کوئی نہیں بولا۔شاید کسی نے سنا نہیں۔

''ادھر وہ گھر سے نکلتے ادھر بابو بھائی روپیہ کے بتیس لفافے لے آتے۔جس کسی نے پتہ دیا ادھر ایک لفافہ لکھ دیا اور جب تک جواب نہ آتا ایسا ہی کرتے رہتے اور وہ بھی ایسے تھے،اب انھیں کس منہ سے کوسوں، کہ جواب تک نہ دیتے تھے۔بابو بھائی جب بھی ان سے آنے کی درخواست کرتے وہ یہی عذر لکھ بھیجتے۔کیسے آؤں! کیوں کر آؤں! میں بابو بھائی سے ہمیشہ یہی کہتی لکھ دو۔''کیا پاؤں میں مہندی لگی ہے جو آ نہیں سکتے یا ہیجڑے راہ مارتے ہیں؟''اور جب بابو بھائی انہیں یہ لکھتے کہ یہ بھابھی نے لکھوایا ہے تو آنے کی تیاری شروع کر دیتے گو آ نہ سکتے۔۔۔''

''آ کیوں نہ سکتے،نانی اماں؟''فہیم نے پھر پوچھا۔

''بابا تمہیں سمجھ تو ہے نہیں خواہ مخواہ باتیں سن رہے ہو۔''نعیم نے تنگ آ کر کہا۔''بھلا کس کی باتیں ہو رہی ہیں؟ کچھ خبر بھی ہے۔یا یوں ہی رت جگا منائے جاتے ہو؟''جب نانی اماں نے بھی یہی کہا''بیٹا تم سو جاؤ۔مفت میں نیند خراب کرتے ہو۔نہ کچھ تمہارے پلے پڑتا ہے۔نہ ہمیں بات کرنے دیتے ہو۔''تو فہیم خاموش ہو گیا۔اس کے ننھے سے دل کی جھیل میں ہر بات کنکر کی طرح گرتی۔لہریں پیدا ہوتیں اور پھر بڑھتی جاتیں،اور اتنی دُور تک کی اس کا دل ان حلقوں میں پھنس جاتا،اس طرح سے کہ نکالے نکل نہ سکتا۔

''۔۔۔۔پپ کتا سب سے عزیز تھا اور سچی بات بھی یہی ہے کہ وہ تھا بھی بہت سمجھدار۔ایک بار ہمارے پڑوس میں چوروں نے سیندھ لگائی اور دو صندوق اٹھا کر لے گئے۔پپ چھت کی منڈیر پر کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا تھا۔جب وہ جانے لگے تو ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔تلار کے جنگل میں جا کر انہوں نے دونوں صندوقوں کو دبا دیا۔پپ سب کچھ دیکھتا رہا۔جب وہ چلے گئے تو سیدھا گھر پہنچا اور تمہارے نانا کی چادر پکڑ کر کھینچنے لگا۔وہ نیند میں تھے۔پپ کے زور کا تھپڑ مارا۔۔۔''

''تھپڑ کیوں مارا؟''فہیم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''یار حد ہو گئی۔''سلیم نے کہا۔''کس نے مارا بھلا تھپڑ۔پپ کیا ہوتا ہے بھلا؟''

سلیم کو درشتی سے مخاطب دیکھ کر فہیم پھر چپ ہو گیا۔

''وہ چونک کر اتنی دُور جا کھڑا ہوا''نانی اماں نے پھر شروع کیا۔''اور کوسنے لگا میں نے انھیں اٹھایا کی کوئی خاص بات ہے جو چلا رہا ہے۔وہ اٹھ کر باہر گئے تو گوراندتہ سر پیٹ رہا تھا اور سیندھ لگی دیوار سے چاند کی روشنی اندر جا رہی تھی۔پپ اب بھی ان کے ساتھ چونس! چونس! کرتا بار بار دروازے کی طرف جاتا تھا۔جب اس کی بے چینی حد سے بڑھ گئی تو تمہارے نانا اس کے ساتھ چلے۔ان کے ہمراہ گوراندتہ اور گاؤں کے دو تین دوسرے لٹھ بند جوان بھی۔پپ تلار کے جنگل میں اسی جگہ جا کر زمین کھودنے لگا۔صندوق برآمد ہو گئے۔گوراندتہ پھولا نہ سمایا۔سو روپے تمہارے نانا کو دیے کہ یہ پپ کے دودھ کے لیے ہیں مگر انہوں نے نہ لیے۔۔۔''

''لیے کیوں نہ؟''فہیم نے پھر پوچھا۔

''بس ایسے ہی۔''نانی اماں نے جواب دیا۔

''بس نہ لیے سو روپے۔''نعیم نے فہیم سے کہا۔

''سو روپیہ بھلا کتنا ہوتا ہے؟''پروین بھی چمکی اور فہیم انکے فضول سوالوں سے تنگ آ کر چپ سا دھ گیا۔

''سلیم سو گیا؟''نانی اماں نے پوچھا۔

''ہاں''۔نعیم نے جواب دیا اور اپنی ٹانگ اس کے پیٹ پر رکھ دی۔

بجلی زور سے چمکی اور سب سے اونچی چوٹیج پر چیل کے درخت روشن دان کے شیشوں میں منعکس ہوئے۔جب بجلی چمکتی تو بہت سے بادل کے گرجنے کی آواز سنائی دیتی۔بجلی کی روشنی بالکل سفید نہ تھی نیلگوں سفید تھی۔جس کے حاشیہ پر قرمزی رنگ جھلکتا اور دونوں سروں پر سرمئی گردسی اڑتی دکھائی دیتی۔جب وہ چمک جاتی تو فضا میں دیر تک پیلی سی لہر کانپتی رہتی جس کے چاروں طرف نیلے اور سرخ دھبے سے ناچنے لگتے۔پھر آہستہ آہستہ وہ سبز ہو جاتی۔گہری سبز زمرد کی طرح اور اس رنگ سے زہریلے اور کڑوے سوتے پھوٹتے ہوئے دکھائی دیتے۔جو ساری فضا کو کسلمند بنا دیتے۔ایسے لگتا جیسے ساری فضا تلخ ہو گئی ہے۔اور وہ سبز ٹیڑھی میڑھی لکیر کلر کے مردہ سانپ کی طرح زہر اگلر ہی ہے۔بجلی پھر چمکی اور پہلی سبز مردہ لکیر میں جان پڑ گئی۔اس کا رنگ پھر زرد ہو گیا۔سرخ اور نیلے دھبے ایک بار پھر اس کے گرد گھومنے لگے۔رفتہ رفتہ وہ دونوں منحنی خطوط زرد سے سبز ہو کر نیل ملے گلابی ہو گئے۔ان کے کونے نسواری رنگ اختیار کر گئے۔اور درمیانی جگہ فاختئی رنگ ہو کر دُور دور پھیلے اندھیرے کی جانب بڑھنے لگی۔بجلی کی لاش اندھیارے کے چیونٹے گھسیٹے لیے جا رہے تھے۔کمرے کے اندر کوئلوں پر سفید تہیں بہت دبیز ہو چکی تھیں اور جھنجھری کے نیچے کافی راکھ گر چکی تھی۔کوئلوں کی حدت کمرے میں بڑھتی ہوئی سردی کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھی۔اندر ہر چیز خاموش تھی۔مگر باہر بارش کا شور پھر بڑھ گیا۔

''ایک ایسی سرد رات پپ بھگ کر مرا ہو گا۔''نانی اماں نے پھر کہنا شروع کیا۔

''میں تو گاؤں میں تھی اور تمہارے نانا لورالائی میں پھر تحصیلدار ہو کر آن لگے۔پپ کو وہ اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے۔کتے رکھنے کا شوق ضرور تھا مگر ان کی دیکھ بھال نہ کر سکتے تھے۔سب کام نوکروں پر چھوڑ رکھا تھا۔ایک ایسی ہی سرد رات غلطی سے باہر رہ گیا۔شب بھر مہاوٹ پڑتے رہے۔بہتیرا چیخا چلایا،دروازوں کو کاٹتا کھرنچتا رہا مگر شور میں کسی کو آواز سنائی نہ دی۔دوسرے سب دروازے بند تھے۔صبح جب باورچی دودھ لانے باہر نکلا تو پپ کو دروازے کی دہلیز پر سر رکھے سو رہا تھا۔باورچی نے پچکارا مگر وہ خاموش رہا۔اس نے دودھ کا برتن ایک طرف رکھ کر اس کا سر جو اٹھایا تو وہ اکڑا ہوا تھا۔کوئی دلاسا یا پچکار یا پپ پپ کی رٹ اس کی آنکھیں نہ کھول سکی۔۔۔۔اچانک ہیں تار ملا کہ نائب تحصیلدار صاحب کی طبیعت خراب ہے۔جلد پہنچو۔ہم نے تھوڑا سا اسباب درست کیا۔میاں جی کہنے لگے۔اس کچر گھان کو کہاں اٹھائے پھرو گی۔یہیں چھوڑ جاؤ۔سب سے چھوٹی بچی کو ساتھ لیے چلتے ہیں۔وہ تمہاری امّی تھی۔ان کے نوکر ہونے سے پورا ایک مہینہ بعد پیدا ہوئی تھی۔جب ہم سوار ہوئے تو سب نے تسلی دی اور یہی کہا کہ اب انھیں ساتھ لیتے آنا۔میری بھی یہی مرضی تھی۔راستہ بھر میری

بوڑھی ساس خدا سے منتیں مانگتی گئی۔ وہ گاڑی میں ہر نئی سوار ہونے والی عورت کے پاس جاتی اپنے بیٹے کی صحت اور سلامتی کی دعا کے لیے درخواست کرتی۔۔۔ تمہاری امّی نے ہمیں بہت تنگ کیا۔ سرد ہوا لگی تو چھینک چھینک کر بے حال ہوگئی۔ اور ہمیں بھی پریشان کر دیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ڈاکٹر دوائی دے کر نکلا تھا۔ میں نے باورچی سے پوچھا کی بخار کیسے آیا تو وہ رونے لگا اور پپ کے مرنے کی پوری داستان سنائی۔ جس کا اثر تمہارے نانا کے دل پر بہت گہرا ہوا تھا۔ ''وہ جب بھی کھانا کھانے کے لیے بیٹھتے'' باورچی نے بتایا ''تو پپ پاس آ کر کھڑا ہو جاتا اور وہ روٹی کے کچوندے توڑ توڑ کر دیر تک اس کے آگے پھینکتے رہتے۔ جس دن پپ مرا اور وہ کھانا کھانے بیٹھے تو دیر تک انتظار کرتے رہے مگر وہ دم ہلاتا ان کے پاس نہ آیا۔ حالانکہ وہ خود ہی اسے دفن کر کے آئے تھے۔ روٹی زبر مار کر کے اٹھے تو زمین پر کچلوندوں کا ڈھیر دیکھ کر بے اختیار رونے لگے۔ اس رات بھی بارش اسی شدت سے ہوئی چند گھنٹے ژالہ باری بھی ہوتی رہی تھی۔ موسم اس قدر خنک تھا کی رضائی سے دم بھر کو منہ باہر نہ نکلتا تھا۔ مگر تحصیلدار صاحب ساری رات صحن میں گھومتے رہے اور اونچی آواز میں فارسی کے شعر پڑھتے رہے۔ میں نے باورچی خانہ کی کھڑکی میں سے دیکھا۔ ان کے کپڑے بھیگ کر جسم سے چپک گئے تھے۔ داڑھی پر پانی کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اور سر کے بالوں سے چھوٹے چھوٹے چشمے جاری تھے۔ دوسرے دن آپ بیمار ہوگئے اور میں نے تار دے دیا۔ یہ کہہ کر باورچی پھر رونے لگا۔ میں وہاں سے آنسو پونچھ کر ان کے کمرے میں چلی آئی۔ میرے سسر ذرا باہر گئے تھے اور ساس چائے بنانے باورچی خانہ جا رہی تھی۔ جب میں ان کے کمرے میں پہنچی تو مجھے دیکھ کر مسکرائے اور بولے۔ ''یہ بھی اچھا ہوا۔ تم لوگ یہاں آ پہنچے''۔۔۔ پھر تمہاری امّی کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ ''یہ رشیدہ ہے؟۔۔۔ اسے میرے پاس لاؤ۔ مجھے اس کی شکل تو دکھاؤ۔'' اور جب میں اسے قریب لے گئی تو بولے۔ ''لاؤ! لاؤ!!! اسے میرے سینے پر لٹا دو۔'' مگر میں نے اس ڈر سے کہ مبادا کوئی متعدی مرض میری بچی کو چمٹ جائے روتے روتے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ اس پر وہ ہنسنے لگے۔ ''اچھا تمہاری مرضی! تمہاری مرضی! میرا دل اسے چومنے کو چاہتا تھا۔۔۔ خیر خیر!'' وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں التجا کرنے لگے تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ آدھی رات کو جب ان کے کمرے میں میں تمہاری امّی کو دودھ پلا رہی تھی تو میاں جی نے لرزتی اور رونکھی آواز میں انّا للہ وانّا الیہ راجعون پڑھا۔ میں چیخ مار کر اٹھی اور تمہاری امّی بھی دودھ کے اس طرح ایک دم چھٹ جانے سے چلانے لگی۔۔۔ دوسرے دن جب ہم وہاں سے چلے تو صوبیدار کریم داد خاں نے، ہیں نعیم! صوبیدار کریم داد خاں نے۔۔۔۔ نعیم! نعیم!!''

مگر نعیم اور سلیم کے خراٹے دوزنگ لگی آریوں کی طرح آپس میں رگڑ کھا رہے تھے۔

''پروین! پروین!!'' نانی اماں نے اسے پکارا ''سبھی سو گئے! میں یوں ہی دیوانوں کی طرح بولتی چلی گئی۔'' انہوں نے رضائی اپنے منہ پر کھینچ کر زور کی جمائی لی اور سدا رہے نام اللہ کا کہہ کر خاموش ہوگئیں۔

فہیم ان کے سرہانے بیٹھا پھسک پھسک روئے جا رہا تھا۔

رات بیت رہی ہے

رات بیت رہی ہے۔۔۔۔اور میں بھی ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ خط لکھوں تو کسے لکھوں۔آج دن بھر دھند چھائی رہی۔ہم اپنے اپنے کیبنوں میں گھسے اخبار اور تصویروں والے رسالے دیکھتے رہے۔چائے آج معمول سے ایک بار زیادہ تقسیم ہوئی۔بعض اوقات ایسی بے قاعدگی بڑی اچھی لگتی ہے۔میں اپنے کمرے سے خراماں خراماں دو دفعہ کنٹرول گیا۔لیکن وہاں کچھ ایسی مصروفیت تھی کہ وہ لوگ ٹھیک سے میری باتوں کا جواب نہیں دے سکے۔موسم خراب تھا اور لاسلکی پیام اچھی طرح سمجھ میں نہ آتے تھے۔اتنا محسوس ہوتا تھا کہ ہمارے سارے لڑاکا طیارے سلامت ہیں۔میں نے ایک دفعہ پیٹر کی آواز پہچاننے کی کوشش بھی کی مگر ناکام رہا۔پھر میں اس طرح راستہ کی ہر ابھری ہوئی کیل اور بڑھی ہوئی لکڑی کو ٹھوکریں مارتا ہوا واپس آ گیا۔جیب سے چیونگ گم کی ایک ٹکیہ نکلی! پتہ نہیں یہ کب سے وہاں پڑی تھی۔کپڑے کی مسلسل رگڑ سے اس کی کھانڈ اتر چکی تھی۔میں نے اسے منہ میں ڈالا تو تم یاد آ گئیں۔اب اندھیرا چھایا ہوا ہے۔سمندر بالکل ساکن ہے۔جہاز میں اب وہ ہٹکورے نہیں۔عرشہ گھر کا صحن لگتا ہے جہاں ہم سب اینٹیں کھڑی کر کے ہاکی سے کرکٹ کھیلا کرتے تھے اور تم نے مجھے خاص طور پر ہدایت کر رکھی تھی کہ گیند انیٹوں کی سیدھ میں نہ پھینکا کروں۔لیکن میری چھ پھینکوں کے بعد جیدی تمہیں پہلی بار ہی آؤٹ کر دیا کرتا تھا۔یہ تو بتاؤ، میں نے کبھی ایسی جرأت کی؟ میرا جی چاہتا تھا تمہیں کبھی بھی آؤٹ نہ ہونے دوں اور تم نے کہا تھا کہ میرا جی بھی یہی چاہتا ہے کہ تم مجھے کھیلاتے ہی رہو۔لیکن اب خود ہی تم نے مجھے اتنی دُور بھیج دیا ہے۔یہاں نہ تو کوئی تمہارے جیسا ہے نہ تمہارے دیس کا! انگریزی کھانے کھا کھا کر میں تنگ آ گیا ہوں۔اردو میں بات کیے تقریباً ڈیڑھ مہینہ بیت چکا ہے اور طرب انگیز لمحہ تو شاید ایک بھی نہیں آیا۔پانی میں زندگی بسر کرتے آج پچیسیواں دن ہے اور پتہ نہیں کتنے دن اسی طرح آسمان کے نیچے اور ساگر کی چھاتی پر گزر جائیں گے۔کل رات پیٹر کیبن میں آیا اور دیر تک بیٹھا رہا۔وہ مارگریٹ کو خط لکھتا آیا تھا۔فضائی حملہ کرنے سے پیشتر ہر امریکن ہوا باز اپنی جانِ تمنا کو ایک لمبا چوڑا خط لکھا کرتا ہے۔پیٹر کی شکل اب تک میری آنکھوں میں گھوم رہی ہے۔وہ میز کے ایک کونے پر بالکل غیر فوجی انداز میں پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا اور مارگیرٹ کی باتیں کرنے لگا۔اس سے متعلق ہر بات شروع کرنے سے پیشتر وہ مسکرا کر یہ ضرور کہتا۔"بھلا تم کسی دوسرے کی داستانِ الفت میں کیا دلچسپی لو گے۔۔۔۔لیکن تم اتنے اچھے ہو کہ اگر دینا میں مارگیرٹ نہ ہوتی تو میں صرف تمہاری دوستی کے سہارے زندگی بسر کر لیتا۔" پھر پرنسٹن یونیورسٹی کی ہلکی سی تمہید کے بعد وہ تیرنے کے اس تالاب کا ذکر ضرور کرتا جہاں پہلے پہل ان کی ملاقات ہوئی تھی۔مجھے کئی ہزار مرتبہ یہ بتانے کے بعد بھی وہ ہر دفعہ اس بات کا تذکرہ ضرور کرتا کہ اس دن مارگیرٹ نے سرخ رنگ کی سکرٹ پہنی ہوئی تھی اور وہ لالے کا پھول دکھائی دیتی تھی جو آسمان سے شبنم کے ساتھ اترا ہو۔

پیٹر کا باپ کسی یونیورسٹی میں جغرافیے کا پروفیسر ہے۔وہ رومن کیتھولک خیالات کا حامی ہے اور انجیل کو چوم کر کھولتا ہے۔اس کی جغرافیہ دانی نے پیٹر کو دیس دیس کی سیر کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ امریکن ہوائی فوج میں بھرتی ہو گیا۔۔۔۔ہم پہلی مرتبہ یہاں ملے ہیں اور ہماری ملاقات کا آج پچیسیواں دن ہے۔امریکن بڑے جذباتی لوگ ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہماری دوستی سالوں کی جگہ منزلیں دنوں میں

طے کر گئی ہے۔ جب میں واپس آؤں گا تو تمہیں پیٹر کی بہت سی تصویریں دکھاؤں گا جو اس نے مارگیرٹ سے ساتھ کھچوائی ہیں۔ ان میں ایک تصویر تو اتنی پیاری ہے کہ رہ رہ کر پیار آتا ہے، جہاں مارگیرٹ ایک سفید دریچے میں سے باہر کے درختوں کو دیکھ رہی ہے اور پیٹر اس کو دیکھ رہا ہے۔ پتہ نہیں یہ کھڑکی میں سے آتی ہوئی روشنی کا اثر ہے یا پیٹر کی آنکھوں کے شراروں کی چمک ہے کہ انتہائی سوچ کے باوجود مارگیرٹ کا چہرہ جگمگا رہا ہے۔ ایسی ہی خوشی سے ایک بار تمہارا چہرہ بھی دمک اٹھا تھا۔ جب میں ۔۔۔۔۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں تمہیں پیٹر کی بہت سی تصویریں دکھاؤں گا۔ اس نے اپنا البم مجھے دے دیا ہے۔

اس وقت آدھی رات سے زیادہ بیت چکی ہے۔ کہر اب بھی چھائی ہوئی ہے بلکہ اس کی تہہ پہلے سے دبیز ہو چکی ہے۔ سارے سمندر پر اندھیرا چھاؤنی ڈالے ہوئے ہے لیکن اب یہ ہول ناک نہیں لگتا۔ گیلری میں کھلنے والے چھوٹے سے روزن سے کچن کی روشنی آ رہی ہے۔ برتن کھنک رہے ہیں اور کنٹرول کی گھنٹیاں بج رہیں۔ پتہ نہیں یہ کب تک بجتی رہیں گی۔ میں تو ہر روز جلد ہی سو جاتا ہوں۔ ننھا بلب جس کی روشنی میز کے ایک مربع فٹ سطح پر مرکوز ہے وقتِ مقررہ پر خود ہی بجھ جاتا ہے پھر صبح چائے کی گھنٹی بیدار کر دیتی ہے۔ یاد ہے، ایک مرتبہ جیدی اور بلّو نے ایک ٹیلی فون بنایا تھا۔ سگرٹ کے دو ڈبوں کے درمیان ایک لمبی ڈور باندھ کر ایک ڈبے میں بولتا تھا اور دوسرا کان سے لگا کر سنتا تھا۔ جب وہ تمہاری امّی کو یہ انوکھی ایجاد دکھانے لائے تو میں ان کے پاس تخت پر بیٹھا پان پر چونا لگا رہا تھا۔ امی چھالیا کتر رہی تھیں۔ تم بھی اسی کمرے میں تھیں۔ تمہاری امّی نے سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ بھیّا کو دکھاؤ۔'' جیدی نے ایک ڈبّہ مجھے دے دیا اور دوسرا تم نے خود بلّو سے لے لیا۔ ہمارے ہم کلام ہونے سے پیشتر ان دونوں سائنسدانوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔ ''یہ کمرہ چھوٹا ہے۔ برآمدے میں چل کر سنیے اور ڈوری کو کھینچ کر رکھیے نہیں تو بات سنائی نہیں دے گی۔'' پھر جب میں نے ڈبے میں منہ ڈال کر کہا ''رینا! تم مجھے ۔۔۔۔۔'' تو تم نے ڈوری ڈھیلی کر دی اور میری بات منہ سے نکلی تو پوری، پر راستے میں پتنگ کی طرح کٹ گئی۔ پھر شاید تم نے میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ لگا کر بات ٹالنے کی کوشش کی تھی کہ بھئی جیدی ٹیلی فون تو اچھا ہے مگر اس میں گھنٹی نہیں بجتی۔ اس نے جواب دیا تھا کہ گھنٹی تو سوتے کو جگانے ککے لیے ہوتی ہے اور یہ ٹیلی فون جاگتے لوگوں کا ہے۔۔۔۔ مجھے جیدی کی بات اب سمجھ میں آنے لگی ہے کہ گھنٹیاں کیوں کر جگایا کرتی ہیں۔

ابھی چند منٹوں کی بات ہے میں سگریٹ سلگا کر جلتی ہوئی دیا سلائی کا شعلہ دیکھ رہا تھا کہ ہارلو آ گیا اور میری کرسی کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ میرے طیارے کا توچی ہے۔ پہلے نیویارک میں ایک فٹر تھا۔ پھر ایرمین بھرتی ہو گیا اور دو ہی سالوں میں ایک اچھا نشانچی بن گیا۔ مخالف طیّاروں پر اس کی ماری ہوی باڑھیں آج تک اکارت نہیں گئیں اور ایک مرتبہ اس کے نشانہ میں آ گیا پھر نہیں ابھرا۔ ابھی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ''میں جہاز کے نچلے عرشہ سے ہو کر آیا ہوں جہاں ہمارا طیّارہ پڑا ہے۔ اس کی آب و تاب ہی نرالی ہے اور وہ دوسرے طیّاروں میں سب سے الگ دکھائی دیتا ہے میں اس کے پروں پر صلیب کا نشان بنا کر آیا ہوں۔ خداوند یسوع مسیح نے آج تک میرے طیّارے کو سبکسار نہیں کیا۔ اب بھی اس سے یہی دعا ہے'' ۔۔۔۔۔ پھر وہ ذرا جھک کر بولا۔ ''آپ نے کسی کو خط نہیں لکھا! میں تو تین لفافے لکھ کر ڈاک کے ڈبے میں چھوڑ آیا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ ڈالی کو بھی خط لکھوں یا نہیں۔ وہ میری سب سے پہلی آشنا ہے۔''

وہ تو چلا گیا لیکن مجھے ایک گہری سوچ میں چھوڑ گیا۔ اچانک مجھے تم یاد آ گئیں اور میں سوچنے لگا کہ کس کو خط لکھوں اور میں ابھی تک کچھ فیصلہ نہیں کر سکا۔

جن دنوں میں ایف۔اے پاس کر کیا چھا خاصا آوارہ گردہ ہو گیا تھا تو میری والدہ نے تمہاری امّی سے تمہاری موجودگی میں میری خودسری کی ساری داستان کہہ دی تھی اور تمہاری امّی صرف اتنا کہہ کر چپ ہو گئی تھیں کہ اج کل کے سارے لڑکے باغی ہو گئے ہیں اور تم نے مجھے اسی دن ڈیوڑھی میں روک کر کہا تھا۔"بی۔اے کا داخلہ ابھی بند نہیں ہوا۔کسی کالج میں داخل کیوں نہیں ہو جاتے۔" تو میں نے کہا تھا۔"ہو جائیں گے۔ایسی کونسی جلدی ہے۔میرا دل پڑھنے کو نہیں چاہتا۔"

"لیکن میرا چاہتا ہے۔"

"تم تو پڑھ ہی رہی ہو۔"

"اپنے لیے نہیں تمھارے لیے کہہ رہی ہوں۔۔۔۔۔کم از کم بی۔اے تو کر لو۔"

"بی۔اے۔" میں نے کہا۔"تم کہتی ہو تو سوچیں گے۔"

"لیکن اے، بی کورس لے کر کرنا ہوگا۔"

"اے، بی کورس یعنی حساب!"

"ہاں۔"

"لیکن رینا یہ تو بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔آگے ایف۔اے ہی بڑی مشکل سے پاس کیا ہے۔"

" اچھا اے کورس اور فلاسفی سہی۔"

"مگر۔۔۔۔"

"اگر مگر کچھ نہیں۔" تم نے کہا۔"پہلے ہی تم کو بڑی رعایت دے دی ہے۔"

دوسرے دن میں کالج میں داخل ہو گیا۔پھر تم بڑی عزت کرنے لگیں اور مجھ سے ضدّی بچّوں کی طرح چمکار چمکار کر کام لینے لگیں۔

ایک دفعہ جب میں تمہارے چھوٹے بھائی کے ساتھ تمہیں کالج سے لانے کے لیے چچا ابا کی موٹر لے کر آیا تو تم نے کار میں بیٹھتے ہوئے اپنے بھائی سے کہا تھا۔"ارشد تم مت چلانا۔" اس دن مجھے تمھاری نظروں میں اپنی برتری کا احساس ہوا تم مجھے اچھی لگنے لگیں۔بہت اچھی، سب سے اچھی!

ایسے ہی ایک دن جب میں ایک لفافہ جس کے فلیپ کی گوند تقریباً اتر چکی تھی پانی لگا کر بند کر رہا تھا تو تم ہنس پڑی تھیں اور لفافہ میرے ہاتھ سے جھپٹ کر کہا تھا۔"یہ ایسے بند نہیں ہوگا۔" جکڑنے والی چیز اکھڑ چکی ہے۔یہاں تو یہی پرانا طریقہ استعمال کرنا پڑے گا۔" اور پھر لب لگا کر لفافہ بند کر کے آکسفورڈ ڈکشنری کے اندر رکھ دیا تھا۔لیکن میں نے فوراً وہاں سے یہ کہہ کر کھینچ لیا تھا کہ "ٹھہرو مجھے بھی تو یہ طریقہ سیکھ لینے دو۔خدا معلوم پھر کتنے ہی ایسے لفافوں سے پالا پڑے۔" لفافہ پھر کھلا، زبان دوبارہ پھری اور پھر اسی طرح آکسفورڈ